باب۔۲

ترجمہ
فص شیثیہ
حکمت نقشیہ

نفث کے لغوی معنیٰ پھونکنے کے ہیں۔ یہاں افاضۂ وجود و عطایا و القا (یعنی وہ بات جو کسی کے دل میں اللہ کی طرف سے ڈالی گئی ہو) مراد ہے۔ شیث کے لفظی معنیٰ ہبہ (یا تحفے) کے ہیں۔ آدم علیہ السلام کے فرزند کا نام (شیثؑ) ہے، جو نبی تھے۔

واضح ہو کہ بعض عطایا بتوسط انسانوں کے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً استاد اور مرشد وغیرہ۔ بعض غیر انسانوں کے توسط سے مثلاً حق تعالیٰ و ملائکہ وغیرہ۔ پھر عطایا دو قسم پر ہیں۔ ۱) عطایاے ذاتیہ: جن کا منشا ذاتِ حق اور بلا واسطہ (کے) ہیں۔ ۲) عطایاے اسمائیہ: جو بتوسط اسما کے ہیں۔ یہ دونوں اہلِ ذوق کے پاس باہم ممتاز ہیں۔ نیز بعض عطایا وہ ہیں جن کے لیے سوال میں تعین کیا جاتا ہے، یا تعین نہیں کیا جاتا۔ نیز بعض عطایا میں زبانی سوال نہیں ہوتا بلکہ زبانِ حال اور اقتضا کی طلب ہوتی ہے، خواہ عطیۂ ذاتی ہو یا اسمائی۔۔۔ عطیۂ معین: جیسے کوئی کہے خدایا مجھ کو فلاں چیز عطا کر۔ وہ سائل ایسے عطیے کو معین کرتا ہے جو اس کے دل میں (ہے اور اسے) اس کے سوا کسی اور شئے کا خطرہ نہیں ہوتا۔۔۔ عطیۂ غیر معین: ایسے سوال جیسے کوئی کہے یارب مجھ کو وہ عطا فرما جس میں میرا فائدہ اور مصلحت ہے۔ یہ شخص نہ لطیف، نہ کثیف، کسی شئے کا تعین نہیں کرتا۔

سائلین کی دو قسمیں ہیں۔ ناواقف سرّ قدر (تقدیر سے ناواقف) اور واقف سرّ قدر (تقدیر سے واقف)۔ ناواقف سرّ قدر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (ایک) جلد باز اور (دوسرے) محتاط۔ واقف سرّ قدر کی بھی دو قسمیں ہیں۔۔۔ (پہلا) واقف جمیع مقدرات دفعتاً۔۔۔ (اور دوسرا) واقف جمیع مقدرات تدریجاً۔۔۔ واقف جمیع مقدرات تدریجاً کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کو علم تقدیر قبل از وقوع ہو جاتا ہے۔ دوسرا وہ (جس سے کہ) بعدِ وقوع، آدمی واقف ہو جاتا ہے۔

جلد باز و مستعجل وہ شخص ہے جس کی طبیعت کی بے صبری و عجلت نے سوال پر برانگیختہ کیا ہو۔ کیوں کہ انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔ بعض لوگ اس لیے سوال کرتے ہیں کہ ان کو معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ کے پاس نظام ظہورِ موجودات اسی طرح واقع (ہے) اور علم الہیٰ میں یہ مقدر ہے کہ عطیہ بغیر سوال اور دعا کے حاصل نہ ہو گا۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہے کہ شاید وہ چیز جو میں چاہتا ہوں اسی قبیل سے ہو۔ لہٰذا اِس کا سوال احتیاطاً ہے، اور یہ سوال امکانِ اجابت (یعنی قبولیت کی توقع) پر مبنی ہے۔ اس شخص کو معلوم نہیں کہ خدا کے علم میں کیا ہے۔ نہ اس کو اپنے استعدادِ جزئی کے قابل قبول ہونے کا علم ہے۔ ہر وقت، ہر شخص کی استعدادِ جزئی پر واقف ہونا باریک تر معلومات سے ہے۔ ایسا باریک بین اگر استعداد (اور اپنی قابلیت) سے واقف ہوتا تو کبھی سوال نہ کرتا۔

وہ لوگ جن کو استعداد اور کامل علم نہیں، ان کو علم استعداد اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا وقت آجاتا ہے۔ (وہ) اپنے حضور الی اللہ سے اس شئے کو جان لیتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا۔ یہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کو جو کچھ ملا ہے ان کی استعداد (یعنی لیاقت) کی وجہ سے ملا ہے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ بعض لوگ پہلے ہی سے استعداد سے واقف رہتے ہیں، پھر ان کو مطلوب ملتا ہے۔ یہ لوگ ان لوگوں سے زیادہ بہتر ہیں جن کو وقوع کے بعد استعداد کا علم ہوتا ہے۔

اہلِ حضور ہی کی ایک قسم وہ ہے جن کا سوال نہ جلد بازی پر مبنی ہے نہ امکانِ اجابت پر (یعنی قبولیت کی توقع پر)۔ بلکہ سوال سے امر الٰہی و حکم خداوندی کی تعمیل اور امتثال (یعنی حکم بجالانا) مطلوب ہے۔۔۔ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ، (یعنی مجھ سے) مانگو میں قبول کرتا ہوں، (غافر:۶۰)۔ اس دعا کرنے والے کی ہمت، مطلوب و معین و غیر معین کسی سے متعلق نہیں۔ اس کا ارادہ صرف اس قدر ہے کہ مالک کے حکم کو بجالائے۔ اقتضائے حال ہوا، تو از راہِ بندگی سوال کیا۔ تفویض الی اللہ (یعنی اللہ کے حوالے کرنے) اور سکوت (یا خاموشی) کا اقتضا ہوا، تو چپکے اور خاموش رہا۔

ذرا ایوب علیہ السلام وغیرہ انبیا اور اولیا کے احوال پر غور کرو۔ ایک زمانے تک وہ موردِ بلایا (یعنی نہایت تکلیف میں) رہے۔ (لیکن انہوں نے صحت یابی یا) رفع کے لیے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا۔ پھر جب دوسرے وقت ان کے حال نے اقتضائے دعائے رفعِ بلا کیا (یعنی جب اپنی تکلیف کے دور ہونے کے لیے دعا کی) تو سوال کیا۔ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ، [(یعنی) میرے رب! مجھے بہت ہی تکلیف دہ بیماری ہو گئی ہے، اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، (الانبیآء:۸۳)]۔ اور خدا نے بلا کو دفع کر دیا۔

اجابتِ دعا کے دو معنی ہیں۔ ۱) اللہ تعالیٰ کا لبیک کہنا۔ ۲) مطلوب کا پورا کرنا۔ لبیک کہنا تو ہر دعا کے ساتھ فوراً ہوتا ہے۔ اب رہا مطلوب کا پورا ہونا، تو یہ وقتِ مقدر پر موقوف (و منحصر) ہے۔ اگر اجابت (یعنی قبولیت) کا وقت آگیا ہے تو فوراً مقصود عطا کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا وقت، آخرت میں یا دنیا میں بدیر مقدر ہے تو اُسی وقت مقصد پورا کیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کو خوب خیال کر رکھو۔۔۔ قسم ثانی (یا دوسری صورت یہ ہے کہ) بے سوال عطا ہو۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ کوئی عطا، بے سوال کے نہیں ملتی۔ سوال زبانی بھی ہوتا ہے اور بغیر زبان کے بھی ہوتا ہے۔ جہاں سوال، زبانِ قال سے (یعنی زبانی) نہیں ہوتا، وہاں زبانِ حال یا زبانِ استعداد سے (یعنی چپ چاپ) ہوتا ہے۔ جس طرح کہ حمدِ مطلق کبھی لفظ میں ہوتی ہے کبھی معنیٰ میں۔۔۔۔ بہر حال حمد کو حال مقید کر دیتا ہے۔ جو شئے باعثِ حمد الٰہی ہوتی ہے وہی تم کو اس اسم فعل سے مقید کر دیتی ہے۔ مثلاً اگر اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلایا ہے تو تم الحمدللہ کہتے ہو۔ فی الحقیقت تم نے یہ کہا ہے الحمد للمطعم یعنی کھلانے والے کا شکریہ۔ ٹھنڈا پانی پی کر تم نے الحمد للہ کہا تو در اصل تم نے الحمد للساقی کہا۔ یعنی پانی پلانے والے کا شکریہ۔ یا پھر اسم تنزیہہ مقید کر دیتی ہے، الصمد (بے نیاز ہستی) اور القدوس (برائیوں سے پاک ذات) سے۔ بندہ اپنی استعداد کو نہیں سمجھتا مگر اپنے حال کو سمجھتا ہے۔ کیوں کہ باعثِ دعا کو، جو حال ہے، بندہ سمجھتا ہے۔ غرض کہ سوالِ استعداد، خفی تر سوال ہے۔ ان لوگوں کو سوال سے یہ امر روکتا ہے کہ وہ جانتے ہیں اور ان کو علم رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نظام عالم میں پہلے سے کیا مقدر کر دیا ہے۔ وہ، اپنے دل کو خوگر کرتے ہیں (اور عادی بناتے ہیں) کہ تقدیر کے موافق اللہ جل مجدہٗ کی طرف سے جو وارد ہو اور آئے، اسے قبول کریں۔ وہ اپنے نفوس شہوانیہ و اغراض نفسانیہ سے غائب ہیں۔ ان اہل حضور میں سے ایسے عارف بھی ہیں جو جانتے ہیں کہ خارج میں اشیا موجود ہونے سے پیشتر اپنے عین ثابتہ کے علم الٰہی میں رہنے کی حالت میں ان اشیا کے خاص خاص اقتضاءات تھے۔۔۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ وہی عطا کرتا ہے جو عین ثابتہ کا اقتضا اور فطرت کا تقاضا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بندے کے متعلق حق تعالیٰ کا علم کہاں سے حاصل ہوا۔ ایسے اہل اللہ سے {اولیا کی} کوئی اور صنف، زیادہ اعلیٰ و صاحبِ کشف نہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ واقفِ سرّ قدر (یعنی تقدیر کے بھید جانتے) ہیں۔ واقف سرّ قدر کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو سرّ قدر کو اجمالاً جانتے ہیں اور بعض سرّ قدر کو تفصیلاً جانتے ہیں۔ جو سرّ قدر کو تفصیلاً جانتے ہیں وہ اُن حضرات سے اعلیٰ اور اُتم (عمدہ) ہیں جو اجمالاً جانتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ علم الٰہی میں بندے کے حق میں کیا متعین ہے، خواہ اس کو حق تعالیٰ ہی نے اس کی اطلاع دی ہو۔ جو کچھ بندے کے عین ثابتہ کا اقتضا علم الٰہی میں ہو یا حق تعالیٰ نے بندے کے عین ثابتہ کو منکشف کر دیا ہو، اور اس کے غیر متناہی احوال جو ہمیشہ اس پر بدلتے اور منتقل ہوتے رہتے ہیں، ظاہر ہو گئے ہوں۔ اس لیے کہ اس کا اپنے عین ثابتہ کو جاننا بمنزلہ علم اللہ کے ہے۔

دونوں کا علم ایک مقام ایک معدن (و منبع) یعنی عین ثابتہ سے ہے۔ مگر کہاں علم الٰہی اور کدھر علم عبد۔ حق تعالیٰ کی سابقہ عنایت ہوتی ہے تو بندے کو ایسا کشف ہوتا ہے۔ بندے کا وجود بالعرض ہے تو اس کا علم بھی بالعرض ہو گا۔ یہ عنایتِ حق بھی اس کے عین ثابتہ کے اقتضاءات سے بندے کو ایسا کشف اسی وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس بندے کو اس کے عین ثابتہ کے حالات پر اطلاع بخشے۔

عین ثابتہ کی دو حالتیں ہیں۔ ۱) موجود بوجودِ خارجی۔ ۲) قبل وجودِ خارجی۔ اگر حق تعالیٰ بندے کو حالتِ وجودِ خارجی میں عین ثابتہ پر بھی مطلع کر دے تو کیا ہوتا ہے؟۔۔۔ حق تعالیٰ تو بندے کو اس کے موجود فی الخارج ہونے سے پہلے ہی جانتا ہے، اس لیے کہ اعیان ثابتہ بندے کے حالِ عدم میں یعنی قبل وجودِ خارجی، اللہ تعالیٰ کے نسبِ ذاتیہ ہیں۔ ان کی کوئی صورت ہی نہیں کہ غیر حق ان سے مطلع ہو۔

واضح ہو کہ علم حق تین طرح پر ہوتا ہے۔

۱۔ علم ذاتی: اس میں حق تعالیٰ خود ہی عالم، خود ہی معلوم، اور خود ہی علم ہے۔ حق تعالیٰ نے مرتبۂ ذات میں خود کو جانا تو سب کو بھی جان لیا۔ کیوں کہ وہی سب کا منشا و اصل ہے۔

۲۔ علم فعلی: ذاتِ حق سے بذریعہ فیضِ اقدس تمام اشیا کے حقائق و صور، قبلِ خلق، علم الٰہی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر یہ علم نہ ہو تو حق تعالیٰ کے افعال، اضطراری و بے اختیار ہوں گے اور اشیا کو پیدا کرنے کے بعد جاننا لازم آئے گا۔ جو مستلزم جہلِ حق ہے (یعنی معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ پر جہل لازم آجائے گا) اور یہ محال ہے (ناممکن ہے)۔

۳۔ علم انفعالی: تمام اشیا کو پیدا کرنے کے بعد عالم شہادت میں شہود ہوتا ہے۔ علم ذاتی و علم فعلی خدائے تعالیٰ سے خاص ہیں۔ بندے کو ان سے کچھ بہرہ (یعنی فائدہ) و حصہ نہیں۔۔۔ اشیا کے خلق و موجود فی الخارج ہونے کے بعد اعیان و حقائقِ اشیا منکشف ہوتے ہیں تو خالق و خلق کا علم، ایک وضع کا، ایک معدن سے اور بطور شہود کے ہوا۔ اس لیے کہ عینِ خارجی اور وہ شئے جو موجود فی الخارج ہے، منکشف ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بھی اور بندوں کو بھی۔

علم شہودی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ حَتّٰی نَعْلَمَ (یعنی) کہ ہم جان لیں، (محمد:۳۱)، وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ (یعنی) اور ہنوز اللہ نے نہ جانا، (اٰل عمران:۱۴۲ اور التوبۃ:۱۶)۔ یہاں علم سے علم شہودی مقصود ہے جو بندوں کو بھی ہوتا ہے۔ نَعْلَمَ اپنے حقیقی معنیٰ میں ہے، ظاہر المراد ہے۔ جس کا مشرب ایسا نہیں وہ نَعْلَمَ میں تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً، حتیٰ نعلم خلیفتی و رسولی محمد، یعنی یہاں تک کہ ہم جان لیں کہ میرا خلیفہ اور رسول محمدؐ جان لیں۔ (یہاں) حقیقتًا، نَعْلَمَ کی تاویل کی گئی ہے (اُن) متکلمین کی طرف سے جو عقلی جواب دیا کرتے ہیں زیادہ سے زیادہ جواب، حدوث علم الٰہی کا یعنی حَتّٰی نَعْلَمَ سے پہلے علم نہ ہونا بلکہ بعد ہونا، معلوم ہوتا ہے

جو (کہ) حدوث ہے۔ (دراصل) یہ علم کا شئے سے تعلق ونسبت، حادث ہے، نہ کہ اصل علم حادث ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اُنھوں نے علم الٰہی کو زائد از ذات سمجھا۔ علم کا تعلق ذات سے سمجھا۔ علم کا منشاذات کو نہ سمجھا۔ اسی سے متکلم (یعنی مذہبی امور کو عقلی دلیلوں سے ثابت کرنے کی مہارت رکھنے والا) و محقق، اہل اللہ اور صاحبِ کشف ووجدان سے جدا ہو گیا۔ اس وجہ سے کہ اِن کے پاس سب کا منشا حق تعالیٰ ہے۔

اب ہم پھر عطایا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔۔۔ اور کہتے ہیں کہ عطایا دو قسم کے ہیں۔ ۱) عطایاے ذاتیہ۔ ۲) عطایاے اسمائیہ۔ انعامات اور ہبات و عطایاے ذاتیہ ہمیشہ تجلّیِ الٰہی سے ہوتے ہیں۔ یعنی اسماوصفات کا ظہور اعیانِ ثابتہ پر ہوتا ہے۔ {اللہ کا نام کبھی ذاتِ واحدیت پر اطلاق واستعمال کیا جاتا ہے تو کبھی ذات مع جمع جمیع صفاتِ کمالیہ پر۔۔۔ یہاں اطلاق دوم (یعنی عطایا نمبر ۲) ہی مقصود ہے۔ اس لیے کہ مرتبۂ ذات محضہ واحدیت بے رنگِ محض ہے۔ وہاں نہ اسم ہے نہ رسم۔ اور تجلّیِ الٰہی ہمیشہ متجلی، یعنی عین ثابتہ کی استعداد واقتضا کے مطابق ہوتی ہے۔ (اور) اس کے خلاف ہر گز نہیں ہوتا}۔

دیتا ہے ہر ایک کو حکیم جس کی کیسی فطرت ہے

جب یہ ٹھیرا کہ حسبِ استعداد عینِ ثابتہ تجلّیِ حق ہوتی ہے تو متجلی یعنی دیکھنے والا، مرآتِ حق میں اپنی صورت کے سوااور کچھ نہیں دیکھتا۔ اس نے ذاتِ حق کو اور شانِ تنزیہہ کو ہر گز نہیں دیکھا۔ اور ہر گز دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہاں اس کو اتنا علم ضرور ہے کہ وہ حق میں خود کو دیکھ رہا ہے۔ جیسے تم آئینے میں اپنی صورت یا دوسروں کی صورتیں دیکھتے ہو تو کیا آئینے کو بھی دیکھتے ہو۔ ہر گز نہیں۔ آئینے کا کام دکھانا ہے نہ کہ دکھائی دینا۔ آئینہ اگر نظر آجائے تو وہ آئینہ نہ ہوا بلکہ ایک شیشے کا ٹکڑا ہوا۔ مگر اتنا بھی ضرور سمجھتے ہو کہ میں آئینے ہی میں خود کو دیکھ رہا ہوں۔

آئینہ کہے گا کیا، کیا تجھ میں ہے رعنائی
پوچھ اس سے تری قیمت، تیرا ہے جو شیدائی

اودر دل من است ودل من بدست او چوں آئینہ بدست من، و من در آئینہ

(وہ میرے دل میں ہے اور میرا دل اس کے ہاتھ میں، جیسے کہ آئینہ میرے ہاتھ میں ہے اور میں آئینے میں)

خدائے تعالیٰ نے آئینے کو اپنی تجلّیِ ذاتی کا ایک مثال اور نمونہ بنایا ہے۔ تاکہ متجلی لہٗ، یعنی جس پر تجلی ہوتی ہے، جان لے کہ اس نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہی نہیں۔ رویت و تجلی کی کوئی مثال آئینے سے زیادہ بہتر اور مناسب نہیں۔ ذرا آئینہ دیکھتے وقت کوشش تو کرو کہ آئینے کا جرم دیکھوں (لیکن) تم ہر گز نہیں دیکھ سکو گے۔ بعض لوگ جنھوں نے اس قسم کا ادراک کیا، کہنے لگے کہ آئینے کے دیکھنے میں خود رائی یعنی دیکھنے والے کی صورت حجاب رائی ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کا زیادہ سے زیادہ علم یہی ہے۔ مگر حق وہ ہے جو ہم نے کہا کہ نہ آئینہ نظر آسکتا ہے نہ وجودِ حق مرئی ہو سکتا ہے (اور نہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو سکتا ہے)۔ اس مسئلے کو ہم نے فتوحات مکیہ میں بھی بیان کیا ہے۔۔۔ اگر تم کو اس کا ذوق ووجدان حاصل ہو گیا ہے (یا اگر تم میں ایسی

قلبی قوت پیدا ہو گئی ہے جو کچھ جاننے کے لیے ذوق سلیم رکھتی ہے) تو جان لو کہ اس سے اوپر کوئی مرتبہ، علم اور وجدان کا نہیں ہے۔ اس درجے سے اوپر ترقی کرنے کی کوشش بے کار ہے۔ اس سے اوپر کچھ نہیں۔ اس کے بعد عدم محض اور نیستی صرف کے سوا کچھ نہیں۔

تقریر بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ تمھارے اپنے آپ کو دیکھنے کا آئینہ، حق تعالیٰ ہے۔۔۔ اور حق تعالیٰ کے اپنے اسما اور ظہور احکام کے دیکھنے کا آئینہ، تم ہو۔ اور یہ اسمائے الٰہیہ، گو مفہوم میں جدا ہیں مگر ان کا منشا ذاتِ حق ہی ہے۔ لہٰذا امر حق اور امر عبد ایک دوسرے سے متشابہ ہو گئے۔

تو آئینہ، میں ہوں عکس، میں آئینہ، تو ہے شخص
آئینہ جب اٹھا دیا، عکس و شخص کا فرق مٹا

بعض عرفا نے علم میں اظہار جہل و عجز کیا۔ اور کہا، اس امر کا ظاہر کرنا کہ ذاتِ حق احاطۂ ادراک سے خارج ہے، عین ادراک ہے۔ اس لیے کہ غیر ممکن کو غیر ممکن اور محال کو محال سمجھنا ہی عین علم ہے۔ بعض عرفا یہ جان کر کہ ذاتِ حق احاطۂ ادراک سے خارج ہے، خاموش رہ گئے۔ بہر حال ایک خاموش ہے دوسرا اظہار عجز کر رہا ہے (یا انکساری سے کام لے رہا ہے)۔ اظہار عجز کرنے والا آزمودہ کار ہے۔ اس لیے وہ بہ نسبت خاموش کے حق تعالیٰ کو زیادہ جاننے والا ہے۔

یہ شہود و معرفت اور القا، بلا واسطہ، بالذّات اور بالاصالۃ (یعنی براہ راست) صرف خاتم الرسل و خاتم الاولیا کو ہے۔ انبیا و رسل جو دیکھتے ہیں وہ مشکوٰۃ (یعنی روشنیٔ) خاتم الانبیا و الرسل سے دیکھتے ہیں۔ کوئی ولی کچھ نہیں پاتا، مگر مشکوٰۃ خاتم الاولیا سے۔ وہ یوں کہ رسالت و نبوت، بمعنیٰ لغوی خبر دینا (نہیں)، بلکہ بمعنی نبوتِ تشریع و رسالتِ تشریع، انتقال کے بعد منقطع ہو جاتی ہے۔ انبیا و رسل ظاہری تبلیغ نہیں کرتے اور ولایت کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ انبیا و رسل اولیا ہونے کی وجہ سے مشکوٰۃ خاتم الاولیا یعنی افضل الانبیا سے ہی دیکھتے ہیں۔ تو پھر دوسرے اولیا کا کیا ذکر ہے۔ خاتم الاولیا، جو خود خاتم الانبیا ہیں، عمل میں اس شریعت کے خود تابع ہوتے ہیں جس کی وہ تبلیغ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے خاتم الاولیائی حیثیت کا خاتم الانبیا کی حیثیت سے کم ہونا لازم نہیں آتا، کیوں کہ حیثیتِ خاتم الاولیا، حیثیتِ خاتم الانبیا سے ایک طرح سے کم ہے تو ایک طرح سے زیادہ بھی ہے۔

ایک کامل، ایک اعلیٰ مسئلے کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اس کا شاگرد اس کی توجہ ایک چھوٹے سے ضروری مسئلے کی طرف مبذول کراتا ہے۔ یہ ضروری مسئلہ بھی خود اس کامل سے سیکھا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارے اس خیال کی اس ظاہر شرع کے مسئلے سے تائید ہوتی ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے از راہ رحم قیدیانِ بدر کو چھوڑنا چاہا اور جناب عمر رضی اللہ عنہٗ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا۔۔۔ اور حضرت رسول اکرمؐ نے مادہ کھجور

کے درخت کو، نر کے پھول ڈالنے ، جس کو "تابیر" کہتے ہیں، اٹھا دینا چاہا۔ اور دوسروں نے ایک سال، بار (یعنی پھل) کم آنے کی وجہ سے بے صبری کی اور درخواست کی کہ تابیر ،یعنی چھوٹے پھول ڈالنے کی اجازت دی جائے، اور دے دی گئی۔۔۔۔ اس واقعے کے ساتھ ایک دوسرا واقعہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک بی بی نے ایک بکری پکائی۔ حضورؐ نے دست مانگا، اور اس بی بی نے دے دیا۔ پھر مانگا، اس بی بی نے دے دیا۔ پھر مانگا ،اس بی بی نے کہا کہ بکری کے دو ہی دست ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر تو دیتی ہی جاتی تو دست نکلتا چلا جاتا۔۔۔۔ غرض یہ کہ مردانِ خدا کی نظر معرفتِ الٰہی اور اس کے اظہارِ کمال میں مصروف رہتی ہے۔ وہی ان کے مدّ نظر رہتا ہے۔ دنیا کے دھندوں کی طرف ان کا تعلق خاطر نہیں ہوتا، (زیادہ رغبت نہیں ہوتی)۔ اس تحقیق کو جو ہم نے بیان کیا، خوب یاد رکھو۔

ایک دفعہ حبیبِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ دیوارِ نبوت طلائی اینٹوں سے مکمل ہو چکی ہے۔ صرف ایک اینٹ کی جگہ باقی ہے۔ وہ آخری اینٹ، ذاتِ مقدس خاتم الانبیا تھی۔ مگر چوں کہ آپؐ نے حیثیتِ رسالت کو ملاحظہ فرمایا، اس لیے آپؐ نے ایک ہی خشت (یعنی اینٹ) ملاحظہ فرمائی۔ بہر حال ذاتِ گرامی کے بعد دیوار رسالت و نبوت مکمل ہو چکی۔ آپ کے بعد کوئی نبی و رسول پیدا نہ ہو گا۔

حیثیتِ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں حیثیتِ خاتم الاولیا بھی ایسا ہی خواب دیکھے گی۔ آپؐ کے سامنے جو مثال آئی اور جیسا آنحضرتؐ نے خواب میں دیکھا، ایسا ہی خاتم الاولیا بھی دیکھے گی۔ دیوارِ ولایت میں دو خشت کی جگہ ہو گی۔ ایک خشت سونے کی اور ایک خشت چاندی کی۔ جن دو اینٹوں سے دیوار ولایت میں دو خشت کی جگہ باقی ہو گی، ایک خشت سونے کی اور ایک چاندی کی، لگ جانے کے بعد دیوارِ ولایت مکمل ہو گئی، اور بغیر ان کے غیر مکمل و ناقص رہے گی۔۔۔ ایک سونے کی اور ایک چاندی کی خشت اس لیے ہو گی کہ ' خاتم الانبیا' ہی 'خاتم الاولیا' ہے۔ نبوت سونے کی اینٹ کی صورت میں، اور ولایت چاندی کی اینٹ کی صورت میں۔ چوں کہ ولایتِ نبی، نبوتِ نبی سے افضل ہوتی ہے لہٰذا ولایت نبی سونے کی اینٹ اور نبوت نبی چاندی کی صورت میں نمایاں ہو گی۔ خاتم الاولیا اپنے آپ کو ان دو اینٹوں کی جگہ چسپاں دیکھے گا۔ خود خاتم الاولیا جو خاتم الانبیا بھی ہے، دو اینٹیں ہو گا جن سے دیوارِ ولایت مکمل ہو گی۔

خاتم الاولیا کے بحیثیتِ ولایت، دو اینٹیں دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہر شرع میں خاتم الرسل کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ اتباع چاندی کی اینٹ میں متمثل ہو گی (یعنی زیور میں چاندی کا جو مقام ہے اس سے مشابہ ہو گی)۔ ظاہر شرع سے مراد احکام شرع میں جن کی وہ خود اتباع کرتے ہیں۔ حالاں کہ بحیثیت خاتم الاولیا،

آنحضورؐ تمام احکام، باطن سے لیتے ہیں اور ظاہر میں خود ان کی اتباع فرماتے ہیں۔ نماز روزہ و دیگر احکام بجا لاتے ہیں تو اتباعِ رسالت میں بجالاتے ہیں۔ خاتم الاولیا، واقعے اور نفس الامر کو ایسا ہی پاتے ہیں تو عالم مثال اور خواب میں ایسا ہی دیکھیں گے۔ خاتم الاولیا کا قرب، باطن میں سونے کی اینٹ ہے۔ آپ اسی مقام یعنی جانبِ قرب الٰہی سے لیتے ہیں اور ملک یعنی فرشتہ، وحی لے کر جانبِ رسالت کو پہنچاتا ہے۔ سچ پوچھو تو خود فرشتہ جانبِ قرب اور ولایتِ محمدیؐ سے لیتا ہے اور جانبِ رسالت کو پہنچاتا ہے۔ اگر تم نے اس تحقیق کو خوب سمجھ لیا تو تم کو بڑا نافع علم حاصل ہو گیا۔

(اہم نوٹ:) واضح ہو کہ حضرت شیخ (ابن عربیؒ) نے، بحیثیت فنائیت و مظہریتِ خاتم الانبیا، خود ایسا ہی خواب میں دیکھا اور فتوحات مکیہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شیخ کی عبارت سے کبھی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور ولی کی مشکوٰۃِ ولایت سے لیتے ہیں، یا کسی اور ولی کو راست قربِ حق نصیب ہوتا ہے۔۔۔(مترجم)

نہ اٹھا ہے نہ اٹھے گا کبھی یہ بیچ سے پردہ
تو اے نورِ خدا بے شک حجابِ روے وحدت ہے

ہر ایک نبی، آدم سے آخر نبی تک مشکوٰۃ (یا روشنی) خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرتا اور لیتا ہے۔ خاتم النبیین، اگرچہ وجود خارجی میں متاخر اور بعد ہیں مگر، اپنی حقیقت و روحانیت کی وجہ سے پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہی معنیٰ ہیں کنت نبیا و آدم بین الماء والطین کے، یعنی میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم ابھی آب و گل میں تھے (حدیث۔ الأسرار المرفوعۃ في الأخبار الموضوعۃ)۔ دوسرے انبیا اس وقت نبی ہوئے جب کہ پیدا ہوئے اور مبعوث ہوئے۔ اسی طرح خاتم الاولیا صلی اللہ علیہ وسلم ولی تھے، اور آدمؑ پانی اور مٹی میں تھے۔ وہ اولیا، جو غیر خاتم الاولیا ہیں، اس وقت ولی ہوتے ہیں جب کہ شرائطِ ولایت کی تکمیل کر لیں۔ وہ شرائطِ ولایت کیا ہیں؟۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے ان اخلاق و اوصاف سے جن سے وہ ولیِ حمید کے اسم سے مسمیٰ ہے، متصف ہو جائیں (یعنی ان میں قابلِ تعریف اوصاف پیدا ہو جائیں)۔ خاتم الرسلؐ سے انبیا کو جو نسبت ہے وہی نسبت خاتم الاولیا سے اولیا کو ہے۔ حضورؐ، ولی بھی ہیں اور رسول و نبی بھی ہیں۔

اب رہ گیا خاتم الاولیا کا مظہر، جو ولیِ وارث ہے۔ وہ اپنی فنائیت و مظہریت کی وجہ سے بظاہر اصل و معدن سے لیتا ہے۔ اور تمام مراتب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ مظہر ختم ولایت، ایک نیکی ہے نیکیوں سے، خاتم الرسل و اولیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مقدم جماعت، پیشوائے انبیا و اولیا ہیں

اور بابِ شفاعت کے کھولنے میں سیدِ اولاد آدم ہیں۔ خدائے تعالیٰ کا فضلِ خاص ہے جو اور انبیا کو عام نہیں۔ ہر چند کہ تمام مخلوقات میں اسمائے الٰہیہ کا ظہور ہے۔ اور ممکن کا جب وجود ہی بالعرض ہے تو اس کی اور کیا چیز ذاتی ہو گی۔ تاہم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفیع المذنبینؐ کو، جن میں رحمتِ حق مخفی ہے، بظاہر اسمائے الٰہیہ پر تقدم (اور فوقیت) ہے کیوں کہ اسم رحمٰن، اسم منتقم کے پاس عاصیوں کی سفارش نہیں کرتا، مگر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے بعد۔ لہٰذا امر شفاعت میں تاجِ سیادت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ہی رہا۔ جو شخص مراتب و مقامات کو سمجھتا ہے اس پر ہمارے اس کلام کا سمجھنا بھی دشوار نہیں۔

اب ہم پھر عطایا کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ یہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے کہ عطایا دو قسم کی ہیں۔ عطایائے ذاتیہ اور عطایائے اسمائیہ۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر رحمت فرما کر عطائے اسمائیہ عطا فرماتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عطایا، اسمائے الٰہیہ ہی سے پیدا ہوں گے نہ کہ ذاتِ محض سے۔ عطایائے اسمائیہ کی تین قسمیں ہیں (اور) رحمت کی تین قسمیں ہیں۔ ۱) رحمتِ محض۔ ۲) دنیا و نفس کے مطابق۔ ۳) آخرت و روح کے موافق، اور جسم کے ناموافق۔ اب ہم ان کی تفصیلی بحث کرتے ہیں۔ بعض عطایائے رحمت، خالص ہوتے ہیں جن میں دنیا و آخرت دونوں میں راحت و لذت ہے۔ جیسے رزق حلال لذیذ۔ رحمتِ محض، اسم رحمٰن سے ہوتی ہے لہٰذا اس کی عطایا، عطایائے رحمانی کہلاتی ہے۔ بعض رحمت، تکلیف کے ساتھ آمیختہ (ملی جلی) رہتی ہے۔ جیسے بدمزہ کڑوی دوا۔ اس کے پینے میں تکلیف لیکن انجام راحت ہے۔ ایسی بدمزگی آمیز عطا کو عطایائے الٰہی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جو عطایا ہوں گی وہ کسی نہ کسی اسم کے توسط سے جاری ہوں گی۔ ایسی عطایا کو عطایائے الٰہیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اللہ سے مقصود و ذات مع جمیع صفات کمالیہ ہے، نہ کہ ذاتِ محض۔۔۔ کہ وہ دو جہاں سے مستغنی اور غنی العالمین ہے اور اس کا کوئی مظہر نہیں ہے۔

کبھی اللہ تعالیٰ عطایا بخشتا ہے دستِ رحمٰن سے۔ تو یہ عطایا فی الحال ناملائم و ناموافق طبیعت اور غیر مقصود وغیرہ کی آمیزش سے پاک ہوتی ہیں۔ (اللہ تعالیٰ) کبھی دستِ اسم واسع سے عطا کرتا ہے تو وہ عطایا عام ہوتی ہیں، اور کبھی بدستِ حکیم (عطا کرتا ہے) تو وہ اسم فی الحال بندے کی مصلحت کو دیکھتا ہے۔ یا بدست واھب عطا کرتا ہے تو وہ نہ طالبِ عمل ہوتا ہے نہ (طالبِ) شکر، بلکہ (اس) عطا سے صرف انعام و احسان مقصود رہتا ہے۔ یا بدستِ جبار (عطا کرتا ہے) تو موقع اور بندے کا استحقاق پیش نظر رہتا ہے۔ یا بدستِ غفار (عطا کرتا ہے) تو وہ عبد کے محل اور حال کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر وہ گنہگار اور مستحقِ عقوبت (عذاب کا مستحق) ہے تو عذاب سے بچا لیتا ہے اور رحمت میں چھپا لیتا ہے۔ اگر بندہ بے گناہ اور مستحقِ عذاب ہی نہ ہو تو نفس گناہ اور اس حال

سے بچالیتا ہے جس سے کہ مستحقِ عذاب ہو۔ یعنی گناہ صادر ہونے ہی نہیں دیتا۔ اس وقت پیغمبر کو "معصوم" "معتنیٰ بہ" اور "محلِ عنایت" کہتے ہیں، اور اولیا کو "محفوظ" وغیرہ مناسب نام دیتے ہیں۔۔۔ اسمائے الٰہیہ کو ذات سے زائد سمجھ کر تجلیاتِ اسمائیہ کو عالم مثال میں دیکھ کر، ذاتِ حق سے ایسی غفلت ہوگئی کہ ہر ایک اسم کو جدا جدا دیوتا اور رب النوع وغیرہ سمجھ گئے اور لگے بت پرستی کرنے۔ حالاں کہ دینے والا تو اللہ ہی ہے مگر باعتبار اس اسم کے جو اُس کے خزانوں کا خزانہ دار ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ اپنے خزانے سے عطا فرماتا ہے اس میں معلوم الٰہی یعنی عین ثابتہ کی استعداد اور قابلیت و فطرت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ نیز حق تعالیٰ کے اسم خاص کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

وہی نمایاں ہوتا ہے جس کی جیسی فطرت ہے
دیتا ہے ہر ایک کو حکیم جس کی جیسی لیاقت ہے
قدر وسع آئینہ ظاہر ہوتی صورت ہے
نظم جہاں پر غور کرو جو ہے عینِ حکمت ہے

اللہ تعالیٰ ہر شئے کو مخلوق کرتا ہے تو عین ثابتہ کی استعداد کے مطابق، بتوسط اسم، عدل و حکیم و مقسط وغیرہ مخلوق کرتا ہے، اور وجود خارجی اور اس کے احکام و لوازم عطا کرتا ہے۔

اسمائے الٰہیہ غیر متناہی اور بے حد ہیں کیوں کہ اسمائے الٰہیہ پر آثار و افعال الٰہیہ دلالت کرتے ہیں۔ اور افعال و آثار، غیر متناہی ہیں جو اسما سے نمایاں ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسمائے الٰہیہ بھی غیر متناہی ہوں گے۔ مگر ان غیر متناہی اسما کا مرجع اور ان کے اصول، متناہی ہیں۔ ان اصولی اسما کو امہات الاسما اور حضرات الاسما کہتے ہیں۔ وہ حیات، علم، سمع، بصر، قدرت، ارادہ اور کلام ہیں، اور حقیقت و نفس الامر و منشا میں صرف ایک حقیقت الحقائق و حقیقت حقہ و ذات واجبہ ہے۔ اسمائے الٰہیہ نسبتیں و اضافتیں ہیں جو ایک ذاتِ حقہ پر وارد و متجدد اور اس سے منتزع و موسوم ہوتے ہیں۔ حقیقتِ حقہ ہی، جو واحد ہے، مقتضی ہے کہ وہ اسم جو غیر متناہی طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی بھی ایک حقیقت و طبیعت کلیہ ہو جو دوسرے اسما کی حقیقتوں سے ممتاز اور جدا ہو۔ مثلاً غفار کی ایک جدا حقیقت ہے اور منتقم کی بھی ایک ممتاز حقیقت ہے اور ہاں ان دونوں میں جو مشترک ہے مثلاً "موجود"۔۔۔ اس سے یہ دونوں ممتاز وجدا نہیں۔ جس طرح کہ ایک عطیہ دوسرے عطیے سے اپنے تشخص و تعین کی وجہ سے جدا ہے۔ اگرچہ تمام عطایا، رحمت الٰہی سے حاصل ہوئی ہیں جو ان کی ایک ہی اصل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عطیہ اور ہے، اور وہ عطیہ اور ہے۔

عطایا کے امتیاز کا سبب اسمائے الٰہیہ کا امتیاز ہے۔ چوں کہ حضرتِ اسم اعظم 'اللہ' بہت وسیع ہے اس لیے کسی تجلی میں تکرار نہیں۔ یہی حق ہے اور قابل اعتماد تحقیق ہے۔

علم الاسماء، شیث علیہ السلام سے متعلق ہے۔ {اگر علم اسمائے الٰہیہ میں بحث کریں تو} ان ہی کی روحِ مبارک تمام ارواح اور اشخاص کا ممد و منبع (یعنی معاون اور مرکز) ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ خاتم الانبیاو اولیا صلی اللہ علیہ وسلم کو مواد و امداد صرف اللہ تعالیٰ سے ملتی ہے۔ اور سب کی روحوں کو آپؐ کی روحِ مقدس سے مواد و امداد ملتی ہے۔ تجلیات و عطایا میں سے حضرت ختم ولایت و نبوت صلعم اگرچہ کسی عطیۂ خاص کو عدم التفات کی وجہ سے باقتضائے ترکیب عنصری نہ جانیں، مگر آپؐ اپنی حقیقت اور ابتدا کی طرف توجہ فرماتے ہیں تو عطایا و اسما کو ان کی خصوصیات و تعینات کے ساتھ جانتے ہیں، گو کہ جہتِ عنصری سے نہ جانتے ہوں۔

ذاتِ ختم ولایت و نبوت صلعم، عالم بھی ہے، نہیں بھی ہے اور قابل اتصاف بہ اضداد بھی ہے (یعنی اپنے اندر تضادات کو بھی سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے)، جیسے کہ اصل حقیقت الحقائق یعنی اللہ تعالیٰ، متصف بہ اضداد ہے۔ جلال ہے تو اس کا ہے، جمال ہے تو اس کا ہے۔ وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر ہے۔ ختم ولایت و نبوت عینِ حق ہے، باعتبار منشا اصل حقیقت کے، اور غیر حق بھی ہے، باعتبار انتزاعیت و مفہومیت کے۔ لہٰذا آپؐ علم رکھتے بھی ہیں (اور) نہیں بھی رکھتے ہیں۔ (آپؐ) دِرایت (یعنی ایسا فہم کہ روایت کی پرکھ کر سکیں) رکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی رکھتے ہیں۔ (آپؐ) شہود رکھتے بھی ہیں (اور) نہیں بھی رکھتے ہیں۔

جلال اک شان ہے تیری، جمال اک شان ہے تیری
عجب تصویرِ قدرت ہے کہ جس میں نور و ظلمت ہے

اسی علم اسمائے الٰہیہ کی وجہ سے 'شیث' نام رکھا گیا۔ اس لیے کہ اس لفظ کے معنیٰ ھبۃ اللہ (یعنی اللہ کا تحفہ) کے ہیں۔ شیث علیہ السلام کے ہاتھ میں مختلف قسم اور نسبتوں کی عطایا کی کلید (چابی) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے شیث نبی دیا اور آدم کو جو دیا گیا وہ تو خود ان میں سے نکلا تھا۔ کیوں کہ الولد سر لابیہ یعنی بیٹا باپ کا راز ہوتا ہے۔ عطیہ شیث، آدم سے نکلا اور آدم ہی کو پہنچا۔ حق شناس و خداداں کو یہ بات کوئی عجیب و غریب اور انوکھی نہ معلوم ہوگی۔ دنیا میں تمام عطایا اسی طرح سے جاری ہوتے اور ملتے ہیں۔ سب کو خدا ہی سے ملتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اصل اصول اور حقیقت الحقائق ہے۔ اور ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو اس کے نفس میں ہے۔ اور جس کی استعداد (صلاحیت) اس کو ہے۔ اگرچہ اس پر کئی صورتیں وارد ہوں مگر ہے اسی کی اور اسی سے پیدا شدہ۔

ہر شخص اس تحقیق سے واقف نہیں اور عطایاے الٰہی کے اس طریقے کو جانتا نہیں۔ جانتے بھی ہیں تو چند اہل اللہ۔ اگر تم ایسے عارف کو دیکھو تو اس پر اعتماد کرو۔ وہ عام اہل اللہ میں سے خاصۂ خواصگان اور علوم صافیہ کا سرچشمہ ہے (بڑا ہی خاص صوفی ہے)۔ جو صاحبِ کشف ایسی صورت کا ہے اس کا عین ہے نہ کہ غیر۔

جو اس کو پہلے سے معلوم اور قبضے میں نہ تھا، مشاہدہ کرتا ہے تو وہ اپنے درخت کا پھل توڑتا ہے۔ اور ہر صاحبِ کشف اپنے کسب و عمل اور اپنی استعداد کا ثمرہ پاتا ہے۔

واضح ہو کہ بعض اولیا کی نظرِ شہود، پہلے تعین پر پڑتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عینِ ثابتہ آئینہ ہے اور اس میں اسمائے الٰہیہ کا ظہور ہے۔ بعض کی نظر، وجودِ حقیقی پر پڑتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ آئینہ وجود میں اعیانِ ثابتہ کا ظہور ہوتا ہے جیسے جِلادار اور صیقل شدہ (یعنی چمکدار اور پالش زدہ) جسم کے مقابل کوئی صورت ظاہر ہوتی ہے۔۔۔ تو کیا شخص و عکس جدا جدا ہیں؟۔۔۔ ہرگز نہیں۔ مگر محل یعنی عالم شہادت یا عالم مثال جس میں وہ شخص دیکھتا ہے اس صورت کو منعکس کر دیتا ہے۔ مگر صورت میں کبھی ایک قسم کا تغیر ہو جاتا ہے۔ یہ تغیر اس مقام و حضرت (یعنی اس مقام اور اس کی حاضری) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے بڑی چیز کا عکس، چھوٹی چیز میں چھوٹا اور مستطیل میں مستطیل اور متحرک میں متحرک معلوم ہوتا ہے (اور) کبھی سرنگوں یعنی سر نیچے، پیر اوپر۔ یہ سب اختلافات، خصوصیاتِ آئینہ کی وجہ سے ہیں۔ بعض آئینوں میں بالکل ہو بہو نظر آتا ہے (یعنی) سیدھا جانب سیدھا (اور) بایاں، بایاں ہی دکھائی دیتا ہے۔ مگر اکثر آئینوں میں سیدھا بایاں اور بایاں سیدھا معلوم ہوتا ہے۔ عام اور عادتی آئینوں میں یہی واقع ہوتا ہے۔ بہت کم آئینوں میں سیدھا سیدھا یا آدمی سرنگوں نظر آتا ہے۔ ان انعکاسات کا مشاہدہ چاہتے ہو تو لافننگ گیلری (laughing gallery) یعنی مضحکہ خیز مقام کو دیکھو، مراد آبادی اگالدان الٹ پلٹ کر دیکھو۔ جس حضرت و مقام میں شہود ہو رہا ہے یہ اس کا اثر ہے۔ اس مقام کو (دیکھو) جس میں مشاہدہ ہو رہا ہے (اور جسے) ہم نے بمنزلۂ آئینہ کے ٹھیرایا ہے۔

بقدرِ وسع آئینہ، ہوا آئینہ گر ظاہر
بنا کر آئینہ خانہ وہی محو تماشا ہے

جو اپنی استعداد (یعنی خوبیوں اور خامیوں) کو سمجھتا ہے، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ میں کیسی صورت لوں گا۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جو صورت قبول کرلے وہ پہلے ہی سے اپنی استعداد کو جانتا ہو۔ ہاں بعد قبولِ صورت جان ہی لے گا کہ میری استعداد ایسی ہی تھی۔ استعداد کا سمجھنا بھی دو طرح پر ہوتا ہے۔ بعض اجمالاً اور بعض تفصیلاً سمجھتے ہیں۔

(نوٹ:) چوں کہ آئندہ جس مسئلے کا ترجمہ کیا جائے گا وہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق چند تمہیدی مسائل بیان کروں گا تاکہ اصل مسائل کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ (مترجم)

یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جو شخص علم و حکمت سے بہرہ ور ہوتا ہے اس کے افعال ارادے کے تابع، ارادہ تابعِ علم و حکمت اور علم تابعِ معلوم ہوتا ہے۔ وہ جیسا معلوم ہے ویسا ہی اس کو سمجھتا ہے۔ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ معلوم کچھ اور ہے اور وہ سمجھتا کچھ اور ہے، کیوں کہ خلافِ واقعہ جاننا جہلِ مرکب ہے۔ اس کا ارادہ

ہمیشہ حکمت پر مبنی ہو گا۔ اس کے افعال ،مقتضائے حال، معلوم کے مطابق ہوں گے۔ خلافِ حکمت و اقتضائے وقت کے کام کرنا سفاہت (بے وقوفی) وحماقت ہے۔بے ارادہ کام کرنا جنون یا اضطرار ہے۔

کیا غیر ممکن ممتنع امر (ناممکن اور ممنوعہ کام)، تحتِ قدرتِ حق ہے؟۔۔۔ ہر گز نہیں۔ قدرت صرف ممکن سے متعلق ہوتی ہے، غیر ممکن سے متعلق نہیں ہوتی۔ غیر ممکن سے قدرت کا متعلق نہ ہونا عجز (یا کوئی مجبوری) نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خدا، ایک دوسرے خدا کو پیدا کر سکتا ہے۔!کون کہتا ہے کہ خدا، اول سے پہلے اول پیدا کر سکتا ہے۔!یا آخر کے بعد ایک اور آخر پیدا کر سکتا ہے!۔۔۔ یہ سب اوہام باطلہ ہیں (فضول شیطانی خیالات ہیں)۔

کیا خدا کی ذاتِ مقدسہ خود خدا کے تحتِ قدرت ہے؟۔۔۔ ہر گز نہیں۔ آدمی خود کشی کر سکتا ہے اس لیے کہ اس کا جینا واجب نہیں۔ خدا خود کشی نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ واجب الوجود ہے۔ ممکنات اس کے تحتِ قدرت ہیں نہ کہ واجب۔ وہ ایسا کامل ہے کہ خود اپنے میں نقص نہیں پیدا کر سکتا۔ خدائے تعالیٰ مستجمع جمیع صفات کمالیہ ہے۔ اس کی صفات کا منشا ذاتِ حق ہے۔ اس کے اسما عینِ حق ہیں۔ عیوب، ذاتِ حق میں محال ہیں۔ وہ ناقابلِ تغیر ہے۔الآن کما کان ہے،(وہ تھا، وہ ہے، اور رہے گا)۔

غرض یہ کہ ممتنعات اور خود واجب تعالیٰ، ناقابل تعلقِ قدرت ہے۔ اس کے بعد واضح ہو کہ بعض ضعیف العقل اہلِ نظر نے جب یہ دیکھا کہ یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیدُ[(یعنی) جو چاہتا ہے کرتا ہے،(ھود:۱۰۷ اور البروج:۱۶)] تو خدائے تعالیٰ پر ایسے امور کو جائز سمجھنے لگے جو منافیِ حکمت اور خلافِ نفس الامر (یعنی دانشمندی اور بات کی اصل روح سے ہٹ کر) ہے۔ مثلاً ایجادِ مثل (خود جیسے، ایک اور کو پیدا کرنا)۔ تعذیب مستحق انعام (یعنی انعام کے مستحق کو عذاب میں مبتلا کر دینا)۔ امکانِ کذب باری تعالیٰ (خدا کو جھوٹا بنا دینا)، اور امکانِ خلقِ اول قبلِ اول اور امکانِ خلقِ آخر بعدِ آخر۔ یہ سب ممتنعات و محالات (ممنوعہ اور ناممکن) ہیں۔ جن کے پیدا نہ کر سکنے سے عجز لازم نہیں آتا،(یعنی کسی طور خدا کو لاچار قرار نہیں دیا جا سکتا)۔ ممکن کے پیدا نہ کرنے کو عجز کہتے ہیں۔ بعض اہل نظر نے وجوب پر اتنا زور دیا کہ امکان کو اُڑا ہی دیا۔ اور صرف وجوب بالذات و بالغیر کے قائل ہوئے۔ جو اضطراری و مجبوری کے مساوی ہے۔ مگر محقق، امکان کا بھی قائل رہتا ہے۔اور اس کے محل کا بھی۔ ممکن کو ممکن جان کر واجب بالغیر بھی مانتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہے کہ واجب الوجود کس طرح مقتضیِ امکان و غیریت ہوا۔ اس تفصیل کو صرف عارف باللہ ہی جانتے ہیں۔

نوعِ انسانی میں جو شخص سب سے آخر پیدا ہو گا وہ قدم شیث علیہ السلام پر ہو گا۔ وہ حاملِ اسرار شیثؑ ہو گا۔ اس کے بعد نوعِ انسانی سے کوئی پیدا نہ ہو گا۔ وہی خاتم الاولیا بمعنیٰ آخر الاولیا ہو گا۔ خاتم بنی آدم ہو گا۔ اس کے ساتھ توامّ بہن پیدا ہو گی۔ وہ پہلے اور بھائی بعد پیدا ہو گا۔ شکم مادر میں بھائی کا سر بہن کے پیروں کے پاس ہو گا۔ وہ چین میں پیدا ہو گا۔ اپنے شہر کی بولی بولے گا۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد مردوں اور عورتوں میں عقم اور بانجھ سرایت کرے گا۔ نکاح و جماع تو بہت ہو گا مگر ولادت نہ ہو گی۔ وہ خدا کی طرف تو بلائے گا، مگر اس کی کوئی نہیں سنے گا۔

جب اللہ تعالیٰ اس کو اس کے ہم زمانہ مومنین کی روح قبض فرمالے گا تو مابقی لوگ مثل بہائم کے (یعنی بہت سخت دل) رہ جائیں گے۔ نہ حلال کو حلال سمجھیں گے۔ نہ حرام کو حرام۔ خواہشِ نفسانی و شہوتِ طبعی کے موافق کام کریں گے۔ ان کے کام عقل و شرع کے منافی ہوں گے۔ انہی لوگوں پر قیامت قائم ہو گی۔

Siddiqui Publications